اشرف صبوحی

غالب نے کہا تھا۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

میں حیران ہوں کہ دلی کے اس البیلے ادیب اور ادیب سے بڑھ کر ایک من موہنی شخصیت اور شخصیت سے بڑھ کر ایک نفیس انسان کا ذکر کن الفاظ میں کروں کہ بیان کا حق ادا ہو۔ سید ولی اشرف صبوحی کی سدا بہار اور دل آویز شخصیت کے ہزار رنگ اور صد ہزار پہلو ہیں۔ کس کو لوں کس کو چھوڑوں؟ دامانِ نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار۔ جوشؔ صاحب نے اپنے بارے میں کہیں فرمایا تھا کہ۔

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

جوش صاحب کی شرافت میں شک کس کافر کو ہے اور اگر جوش صاحب ہی شریف نہیں، تو پھر شریف کون ہوگا؟ اب کوئی صاحب اس شرمندۂ معنی لفظ شرافت کی تشریح کے طالب ہوں تو ''یادوں کی برات'' کا تماشا کریں، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے.... بہر حال ذکر تھا حضرت مولانا الحاج سید ولی اشرف صبوحی دہلوی کا۔ صبوحی صاحب اپنی ذات میں چلتی پھرتی انجمن ہیں۔ سراپا ناز ہیں مگر نیاز کی صورت۔ اس پیری میں جان جاں ہیں تو عہد جوانی میں قیامت سے کیا کم ہوں گے۔ دلی والے ہیں اور دلی والوں کی سینکڑوں اداؤں کی تصویر۔ ایسی ادائیں جن کا رنگ روغن گردشِ لیل ونہار بھی پھیکا نہ کر سکی۔ وہی دم خم ہیں، وہی تیور، وہی لب ولہجہ ہے، وہی انداز وادا۔ وہی آشفتہ سری ہے اور وہی نازک مزاجی جو دلی کے شرفاء سے خاص ہے۔ ایسے لوگ یادگارِ زمانہ ہیں، گئے وقت کی نشانیاں ہیں۔ بعد میں چراغِ رُخِ زیبا لے کر بھی ڈھونڈیئے گا تو اُن صورتوں کو نہ پایئے گا۔

عمرے گزشت و ما بہ امید اشارتے
چشمی برآں دو نرگسِ جادو نہادہ ایم

صبوحی صاحب ہیں تو دلی والے لیکن اس شہرِ نجد لاہور میں ربع صدی کے مسلسل قیام نے انہیں لاہوری بنا دیا ہے۔ انہیں دلی کے کوچہ و بازار سے جس قدر محبت ہے اُس سے کہیں زیادہ اُنس لاہور کے درِ و دیوار سے ہے۔ لاہور نے ایسی بیڑیاں اُن کے پاؤں میں ڈال دی ہیں کہ وہ یہاں سے جانا بھی چاہیں تو جا نہیں سکتے۔ گویا لاہور ان کا وطنِ ثانی بن گیا ہے۔

ایک تو حضرتِ صبوحی دلی والے۔ یہی خوبی کیا کم تھی۔ پھر خاندان ایسا کہ اس میں ایک سے ایک عظیم اور شریف آدمی لے لیجئے.... سرسید کا خاندان، ڈپٹی نذیر احمد کا خاندان، مولوی ذکاء اللہ کا خاندان، راشد الخیری کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا خاندان جس کے افراد حقی کہلاتے ہیں۔ ان تمام خاندانوں کی علمی، ادبی، سیاسی اور معاشرتی خدمات اور وجاہت کا کیا ٹھکانا ہے۔ سرزمین پاک و ہند پر ان خاندانوں کے کتنے گہرے، کتنے وسیع اور کتنے لازوال اثرات ہیں، اس کا حال کسے معلوم نہیں۔

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

ان تمام خاندانوں میں تہ در تہ قرابتیں، رشتے اور عزیز داریاں اس کثرت سے ہیں کہ گل ہائے رنگ رنگ کا ایک بہت بڑا چمن بن گیا ہے۔ صبوحی صاحب اسی چمن کی ایک ہری بھری شاخ بلکہ گلِ صد برگ ہیں۔ وہ تمام خوبیاں ان کی ذات میں نمایاں اور روشن ہیں جو اس عظیم اور وسیع خاندان کے افراد کا طرۂ امتیاز و افتخار ہیں۔ وجاہت، وضع داری، شرافت، انکساری، جود و سخا، علم و کرم، عجز و وفا، علم و قلم۔

اُن کی چال ڈھال نستعلیق، اُن کی نشست و برخاست شائستہ، ان کا سراپا، سراپا وقار و متانت، اُن کا رکھ رکھاؤ خودداری و مروت..... چپ رہیں تو بے سخن بے زباں، بولیں تو بلبل ہزار داستاں..... کسی کا چراغ ان کے سامنے نہ جلے۔ بڑے بڑے زباں آور اور برجستہ گو اُن کے روبرو بونے دکھائی دیں۔

کیا تاب فلاطوں جو کرے چوں مرے آگے

کتنی ہی سیرتیں اور کتنی ہی شخصیتیں اس ایک آدمی میں جمع ہیں ... سرسید کی وجاہت، نذیر احمد کی ذہانت، ذکاء اللہ کی علمیت، آزاد کی آشفتہ سری، داغ کا لہجہ، ذوقؔ کا محاورہ، غالب کی شوخی، مومنؔ کی طبیعت، آزردہؔ کی ثقاہت، بہادر شاہ ظفرؔ کی درویشی، دردؔ کا درد اور میر

مقبول جہانگیر

تقی میرؔ کی بد دماغی ۔ ؎

ڈھونڈا ہے آسماں نے انہیں خاک چھان کے

صبوحی صاحب اس وقت ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ اُجڑے دیار کی رونقوں کے نہ جانے کتنے مناظر اُن کی آنکھوں میں دفن ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد جو اہلِ فن دلی سے نکلے وہ شعاعِ مہر کی مانند بکھر گئے۔ ادیب الملک خواجہ محمد شفیع اور مولانا سید ولی اشرف صبوحی نے لاہور کو اپنے جسم و جاں کا مستقر ٹھہرایا۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم بھی لاہور میں ٹکنا چاہتے تھے۔ اُنہیں لاہور کے در و دیوار سے محبت تھی لیکن آب و دانہ کراچی کی بے آب و گیاہ سرزمین میں لے گیا۔ وہاں اُن پر جو بیتی سب نے سنی سب نے دیکھی۔ آخر کراچی کی مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے۔

یادش بخیر، خواجہ محمد شفیع دہلوی ایک زمانے میں سرتاپا ہنگامہ تھے۔ بہت بڑے بُت شکن، ادیب ابنِ ادیب، تحریر و تقریر کے بادشاہ۔ علم و ادب کی بے شمار شمعیں انہوں نے جلائیں۔ زبان اُن کی لونڈی، بیان اُن کا خانہ زاد، محاورے اُن کے غلام، رعایتِ لفظی اُن کی کنیز۔ ؎

ہر جا کہ رفت خیمہ زدد بارگاہ ساخت

لوگ کہتے کہ خواجہ صاحب خود نہیں لکھتے، اُن کے والد خواجہ عبدالمجید لکھتے ہیں۔ خواجہ شفیع یہ ہرزہ سرائیاں سنتے اور پیچ و تاب کھاتے۔ پھر مضامین نو بہ نو کے انبار لگا کر خوشہ چینوں کو یوں خبر کرتے کہ جیسے ضیغم ڈکارتا ہوا نکلے کچھار سے۔ انہوں نے اردو ادب و انشاء کو مالا مال کیا۔ جب کہنے والے نہ رہے یا ان کے قائل ہو گئے تب خواجہ صاحب نے بھی قلم و قرطاس کی صحبتوں کو خیر باد کہا اور تجارت کی بھول بھلیوں میں ایسے گم ہوئے کہ اب ادب کے میدان میں انہیں پانا دشوار ہے۔

نکل گئے ہیں وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

صبوحی صاحب، صاحبِ طرز ادیب ہیں اور وہ بھی ایسے کہ اپنے فن میں فردِ فرید ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان لکھنے والا آج پورے برصغیر میں اُن جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ قلعۂ معلیٰ اور دلی کے شرفاء کی صاف ستھری، اُجلی اُجلی، نکھری نکھری زبان کے نمونے دیکھنے ہوں تو صبوحی صاحب کی تحریریں دیکھیے۔ سینکڑوں محاورے اور ہزاروں ایسے الفاظ انہوں نے اپنی تحریروں

میں سجا دیئے ہیں جو دوسری جگہ نہ ملیں گے۔ پرنس میرزا خیر الدین خورشید جاہ، جن کا تعلق بہادر شاہ ظفرؔ کے گھرانے سے ہے، چار پانچ برس قبل عارضۂ قلب کا شکار ہو کر میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں داخل تھے۔ ایک روز صبوحی صاحب اور راقم الحروف مرزا صاحب موصوف کی عیادت کے لیے گئے۔ پرنس خیر الدین نے صبوحی صاحب کو دیکھا اور اپنی تکلیف بھول گئے۔ مزاج پرسی اور لطیفہ گوئی کے بعد پرنس خیر الدین نے صبوحی صاحب سے چند ایسے الفاظ کے معنی اور مترادفات دریافت کیے جو کسی زمانے میں قلعۂ معلّٰی میں سلاطین و اُمراء کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور وقت نے جنھیں محو کر دیا تھا۔ صبوحی صاحب نے ایک لحظہ تامل کیے بغیر ان کے معنی اور مترادفات بتا دیئے۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم، صبوحی صاحب کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ شاہد صاحب جب بھی لاہور آتے صبوحی صاحب کے ہاں قیام کرتے۔ اُن کی یہ وضع داری مرتے دم تک قائم رہی۔ صبوحی صاحب کو شاہد احمد کے والد اور ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کا بہت موقع ملا۔ علم و ادب کا شوق خون میں گردش کرتا تھا۔ خامہ فرسائی کی راہ پر چل نکلے۔ مولوی بشیر الدین حیدر آباد دکن کی ملازمت سے پنشن پا کر دلی آئے تو تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے۔ اپنے والد ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ تاریخ و تحقیق سے خاص ذوق تھا۔ نہایت شاندار اور بھاری بھر کم آدمی تھے۔ تصنیف کے مشغلے سے تھکتے تو گھر کے بال بچوں کو لے کر بیٹھ جاتے۔ کسی کو فارسی پڑھاتے، کسی کو اردو کسی کو انگریزی.... صبوحی صاحب کو انہوں نے اردو اور فارسی میں طاق کر دیا۔ ڈپٹی صاحب شاعر بھی تھے۔ سائل دہلوی کے شاگرد لیکن مزہ یہ کہ کبھی استاد کی اصلاح قبول نہ کی، ہمیشہ ان سے چخ ہو جاتی۔ اپنی غزلوں کا مجموعہ دیوانِ بشیر کے عنوان سے مرتب کیا۔ نو جوان صبوحی نے تقریظ لکھ کر پھوپھا کی خدمت میں پیش کی۔ ڈپٹی صاحب اس طفلانہ حرکت پر خوب ہنسے لیکن اصلاح کے بعد اس تقریظ کو دیوان میں شامل کر لیا اور صبوحی صاحب کے نام سے پہلے مولانا اور مولوی کا اضافہ بھی کر دیا۔ یہ ذکر ہے ۱۹۲۴ء کا۔ اس کے بعد تو بقول صبوحی صاحب اُن کے پتنگ کو دریائی مل گئی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

صبوحی صاحب نے ناولوں، افسانوں، کہانیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ایک سے ایک عمدہ چیز اُن کے قلم سے نکلی ہے۔ کسی میدان میں وہ پیچھے نہیں رہے ہیں۔ دلی کی شخصیتیں اور دلی کی تہذیب اُن کے دل پسند موضوع ہیں۔ بچوں کے لیے بھی انہوں نے اپنے اسلوب میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ارمغان اور شاہجہاں نام کے دو ادبی جریدے بھی انہوں نے دلی سے نکالے۔ اُن کے چھوٹے بھائی وصی اشرف صاحب نے اردو بازار میں کتب خانہ علم و ادب قائم کیا جو بعدازاں دلی کے تمام باکمال شاعروں اور ادیبوں کے اُٹھنے بیٹھنے کی ایک مستقل جگہ بن گیا۔ برصغیر کے بے شمار لکھنے والے خواہ کہیں سے دلی جائیں، کتب خانہ علم و ادب پر ضرور حاضر ہوتے تھے۔ قیام پاکستان تک یہ کتب خانہ ایک ادارہ بنا رہا۔

صبوحی صاحب نے بڑے بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ایسے ایسے باکمالوں سے اکتسابِ فیض کیا ہے کہ زمانہ اب اُن کی مثال نہ لا سکے گا۔ خان بہادر میر ناصر علی، سید وحید الدین بیخود، مرزا سراج الدین سائل اور اُن کے بڑے بھائی مرزا شجاع الدین تاباںؔ، آغا شاعر قزلباش، راشد الخیری، میر باقر علی داستان گو، خواجہ حسن نظامیؔ، مرزا فرحت اللہ بیگ، مرزا فہیم بیگ چغتائی، سید ناصر نذیر فراق، سید جالبؔ دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، پنڈت امرناتھ ساحرؔ اور خواجہ عبدالمجید دہلوی وغیرہ.... ان میں سے ہر شخص خود اپنی جگہ علم و ہنر کا ایک روشن ستارہ تھا۔

ان کے علاوہ صبوحی صاحب نے پروفیسر مرزا محمد سعید، مولانا عبدالسلام نیازی اور مولانا محمد اسحاق سے بھی فیض حاصل کیا۔ صبوحی صاحب جیسا برجستہ گو اور حاضر جواب میں نے کوئی نہ دیکھا۔ بات سے بات پیدا کرنا اُن پر ختم ہے۔ ان کی ہر بات لطیفہ ہوتی ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تو باقاعدہ ایک بیاض بنالی تھی اور اس میں صبوحی صاحب کے ملفوظات قلم بند کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد نہ جانے وہ بیاض کہاں گئی۔ اگر مل جائے اور کوئی اللہ کا بندہ اسے شائع کر دے تو غضب کی چیز ہے۔ زندہ دل ایسے کہ روتوں کو ہنسائیں۔ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان، بوڑھوں میں بوڑھے۔ بدمزاجی، چڑچڑے پن سے کوسوں دور...... ہر محفل کی رونق، ہر بارات کے دولہا.... ان کے بغیر احباب کی محفلیں سونی سونی اور پھیکی پھیکی نظر آتیں۔ وضع دار ایسے کہ جس سے جو تعلق قائم ہوگیا اُسے نبھانے

کے لیے دل و جان سے حاضر۔ ہمدرد دواخانہ کے حکیم محمد سعید صاحب سے تعلقات پینتالیس برس کے ہیں۔ وہ اِن پر فدا یہ اُن پر نثار۔ مدت سے لاہور میں شامِ ہمدرد ہوتی ہے اور اس کا اہتمام و انصرام صبوحی صاحب کے ذمے ہے۔ تقریب کا اختتام ہمیشہ صبوحی صاحب کرتے ہیں اور نئے سے نیا جملہ فرماتے ہیں۔ ایسا کہ محفل کشتِ زعفران بن جاتی ہے۔ ایک مرتبہ صحافت کے موضوع پر مقالہ پڑھا گیا۔ یہ تقریب حسبِ معمول انٹرکونٹی نینٹل میں تھی۔ مقالہ خاصا خشک تھا اور کچھ اسے پڑھنے والے ڈاکٹر صاحب کے لب و لہجے نے خشک بنا دیا تھا۔ بہرحال سامعین نے صبر سے سنا۔ اختتام پر صبوحی صاحب مائیک پر آئے اور اپنے خاص انداز میں مہمانوں کو چائے نوشی کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

> ''خواتین و حضرات، ذکرِ صحافت تو ہو چکا۔ اب کچھ ذکر ضیافت بھی ہو جائے۔ چائے کے لیے حوض پر تشریف لے چلیے۔ اسی کے کنارے انتظام ہے۔ خواتین کے لیے خیمے کا الگ اہتمام ہے، وہ وہاں تشریف لے جائیں۔ حور مقصورات فی الخیام......''

سورۂ رحمٰن کی یہ آیت موقع کی مناسبت سے ایسی بجی کہ باید و شاید .... مقالہ نگار کو اپنے طویل مقالے پر وہ داد نہ ملی جو صبوحی صاحب نے اس چھوٹے سے جملے کے ذریعے وصول کر لی۔

حکیم محمد سعید صاحب سے اس قدر قریب ہیں لیکن آج تک حکیم صاحب کو نبض نہ دکھائی اور ایک پیسے کی دوا اُن کے دواخانے سے مفت نہ لی۔ کوئی جواب ہے اس وضع داری کا۔

بڑے بڑے لوگوں سے برابر کے تعلقات ہیں لیکن کیا مجال کہ اپنی کسی ضرورت کسی پریشانی، کسی حاجت کا اُن سے اظہار کریں۔ ہاں دوسروں کے لیے ہر دم حاضر ہیں۔ کوئی ضرورت مند کسی کام سے آیا، صبوحی صاحب فوراً اس کے ساتھ چل دیں گے۔ دھوپ کی پروا کریں گے نہ بارش کی۔ سواری نہ ملی تو پیدل ہی سہی۔ کسی سبب سے ساتھ نہ جاسکیں گے تو رقعہ لکھ دیں گے۔

دامے، درمے، قدمے، سخنے .... کسی طرح دریغ نہیں۔ خواہ آدھی رات کو گھر پہنچ کر آواز دے لیجئے۔

میں نے انہیں ہر رنگ، ہر روپ میں دیکھا اور ایک سچا اور کھرا انسان پایا۔ شاید کرہ ارض پر ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جسے یہ شکایت رہی ہو کہ اُسے کبھی، کسی موقع پر صبوحی صاحب سے اذیت پہنچی ہے یا نہوں نے فریب دیا ہے یا مال مارا ہے، یا کسی کی غیبت کی ہے، کسی کو حقیر سمجھا ہے۔ صبوحی صاحب کی ان خوبیوں اور درجۂ محبوبیت نے ان کے کئی حاسد اور دشمن پیدا کر دیئے ہیں جو انہیں اذیت دینے اور رسوا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے مگر اس کی شکایت کیا کی جائے؟ ایسے حاسد اور ایسے دشمن ہر معاشرے میں ہیں اور ان کی ضرورت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوں تو 'تعرف الاشیا باضدا دہا کی' صداقت کیوں کر ظاہر ہو؟

لاہور کی کسی سڑک پر اگر آپ ایسے شخص کو دیکھیں جس کے سر پر ترکی ٹوپی ہو، بدن پر شیروانی اور علی گڑھ کٹ کا پاجامہ، چہرے پر بہت مختصر سفید ڈاڑھی، آنکھوں پر عینک، گرد جھکائے، بغل میں کوئی کتاب یا بستہ دبائے، نپے تلے قدموں سے تنہا یا کسی کے ساتھ تیز تیز لب و لہجے میں مزے دار باتیں کرتا اور ہنستا کھیلتا چلا جا رہا ہو تو فوراً پہچان جایئے کہ یہ شخص اُجڑے دیار کی یادگار سید ولی اشرف صبوحی دہلوی ہے۔ نفیس آدمی، شرافت کا پتلا، شائستگی کا مجموعہ، ہنس مکھ، ملنسار، حاضر جواب، انکساری کی تصویر، شاہ جہاں اور بہادر شاہ ظفر کی دلی کا روڑا۔

کس قدر بانکی ہے تیری اے صبوحی بول چال
کیوں نہ ہو آخر تو روڑا ہے جہاں آباد کا

□□□

اشرف صبوحی۔ ولادت: ۱۱مئی ۱۹۰۵ء۔ وفات: ۲۲اپریل ۱۹۹۰۔
اشرف صبوحی کی یادگار کتابوں میں شامل ہیں: دلی کی چند عجیب ہستیاں، غبار کارواں اور جھرو کے۔